پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم

قدیم یونانی مفکّروں کا تصوّرِ جمالیات

جمالیات فلسفہ کی وہ شاخ ہے جو حسن و جمال یا دلکشی سے بحث کرتی ہے۔ فلسفۂ قدیم نے بحیثیت علم و فن اس کو کوئی مستقل شعبہ تسلیم نہیں کیا۔ یونانی حکمت بھی اس سے معرا نظر آتی ہے اور یہ امر کسی قدر باعثِ تعجب ہے۔ کیونکہ یونانی قوم ایک حسن آفرین اور حسن پرست قوم تھی اور اس کے ساتھ ہی زندگی کے ہر شعبے کو حکمت کے تحت لاکر سمجھنے کی عادی تھی۔ اس طبعی موزونیت کے باوجود انھوں نے اس علم کو کوئی مستقل حیثیت نہیں بخشی۔ اب مغربی زبانوں میں اس علم کے لیے جو اصطلاح استعمال ہوتی ہے اس سے براہِ راست اس علم کا موضوع واضح نہیں ہوتا۔ AESTHETICS کے اصل معنی حسّی ادراک کے ہیں۔ فلسفۂ جدید میں کانٹ نے بھی اس لفظ کو انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے، "وجدانِ جمال" کے مفہوم کو اس اصطلاح کے ساتھ فلسفۂ جدید میں ایک السانی مصنف بوم گارٹن (BAUMGARTEN) نے وابستہ کیا۔

اگر ہم اس کی وجہ تلاش کریں کہ فلسفۂ قدیم اس شعبے کو مستقل حیثیت سے کیوں ترقی نہ دے سکا تو اس کا معلوم کرنا کوئی دشوار امر نہیں۔ یونانی فلسفے کا تمام دارومدار عقلیت پر تھا۔ اس کا تمام تر میلان یہ تھا کہ نفس و حیات اور کائنات کے ہر مظہر کو منطقی قوانین کے تحت میں لائے اور جنس و فصل کے عالم گیر سلسلے میں پرو دے۔ زندگی کے جو شعبے براہِ راست منطقی استدلال کی گرفت میں نہیں آسکتے، مثلاً اخلاقیات یا الٰہیات، ان کو بھی وہ سراسر منطق سمجھتے تھے۔ تاثرات، وجدانات اور جذبات کو وہ عقل کے "منافی تصوّرات" سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک اصل حقیقت عقلِ مجرد ہے، ارادہ اور تاثر اس کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ یہ خیال افلاطون کے فلسفے میں عام طور پر اور ارسطو کے فلسفے میں کسی قدر تبدیلی کے ساتھ ہر جگہ طاری نظر آتا ہے۔ فلسفۂ جدید کے آغاز تک تمام فلسفیانہ تفکر یونانیوں کا رہینِ منت تھا، اس لیے جمالیات کو جو تاثر کا علم ہے، اس کے اندر کوئی موقر حیثیت حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔ یونانی فلسفی کے ہاں تاثرات کا علم ایک متناقص

مفہوم ہے، کیونکہ یہ دو چیزیں باہم متضاد اور متخالف ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قدیم دنیا نے حسن و عشق کے تاثرات کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ ایک طرف فنونِ لطیفہ کا ارتقا فلسفے سے بھی پہلے نوعِ انسان کے اندر سرعت سے جاری تھا، دوسری طرف قدیم زمانے سے مذہب کے اندر بھی تاثرات کو ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ہر قوم کا تصوف کسی نہ کسی طرح تاثر سے ایک گہرا تعلق رکھتا ہے۔ تاثرات ہمیشہ فنونِ لطیفہ اور مذہبی وجدان کی آغوش میں پرورش پاتے رہے ہیں۔ لیکن ہمارا مطلب فقط یہ ہے کہ عقلِ خنک فطرت یا ٹھنڈی منطق نے اس شعبے کو بہت زیادہ قابلِ توجہ نہیں سمجھا اس لیے اس کی نسبت کوئی خاص حکیمانہ بصیرت پیدا نہ ہو سکی۔ کسی نے اس کو منطق کے تحت سمجھنا چاہا۔ کسی نے اس کو اخلاقیات میں ملا دیا۔ اور کسی نے اس کو الٰہیات کے بحرِ ذخار میں ڈبو دیا۔ اس خیال کے ثبوت میں ہم مختصر طور پر فلاسفۂ قدیم کے اساسی نظریات پیش کرتے ہیں جن سے اندازہ ہو جائے گا کہ جمالیات کی نسبت ان کے افکار کس قدر سطحی اور سرسری ہیں۔

یونانیوں میں سقراط سے پیشتر کوئی مفکر ایسا نہیں جس نے ماہیتِ جمال کی نسبت کوئی قابلِ ذکر خیال پیش کیا ہو۔ زینوفون کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سقراط جمال کو خیر کے مرادف خیال کرتا تھا اور ان دونوں کو مفاد کے تحت میں لاتا تھا۔ اس کے نزدیک ہر خوب صورت شے کی خوب صورتی یا دلکشی اس امر پر مشتمل ہے کہ اس سے کسی معقول مقصد کا حصول ہوتا ہے، یا اس سے انسان کو کسی قسم کا تحفظ حاصل ہوتا ہے، یا اس کی حاجت پوری ہوتی ہے۔ ذوقِ جمال سے روح کو براہِ راست جو تسکین یا وجدان حاصل ہوتا ہے، سقراط نے اس پر کچھ غور نہیں کیا۔ اس نے جمال کے فقط اس پہلو پر زور دیا کہ وہ مقاصدِ زندگی کے حصول میں معاون ہوتا ہے۔ فلسفیانہ پہلو سے اس کی تعلیم میں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ وہ حسن کی اضافیت (RELATIVITY) کا قائل تھا۔ اس کے نزدیک حسن کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا جو نفسِ مدرکہ سے الگ علی الاطلاق موجود ہو۔ جو چیز جن حالات میں مفید ہوتی ہے ان حالات میں وہ جمیل معلوم ہوتی ہے۔

افلاطون نے مکالمات میں اپنے جو خیالات سقراط کی زبان سے بیان کیے ہیں، ان سے افلاطون کے فلسفۂ جمال کا تعین نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ ان مکالمات میں "جمال" کی مختصر تعریفوں کو

وہ یکے بعد دیگرے رَد کرتا جاتا ہے اور قطعی طور پر اس خیال کی طرف مائل ہے کہ اشیا سے ہم جمالِ مطلق کو اخذ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اشیا کم و بیش طور پر اس سے بہرہ اندوز ہیں اور پوری طرح اس کو ظاہر نہیں کر سکتیں۔ قبلِ ولادت روح خالص "عالمِ عقل" میں رہتی تھی اور جمالِ مطلق کا مشاہدہ کرتی تھی۔ دنیا کی جمیل چیزیں اس زندگی کی یاد روح میں تازہ کر دیتی ہیں لیکن اس امر کی نسبت اس نے کوئی معین نظریہ پیش نہیں کیا کہ جمالِ مطلق کس قسم کی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ افلاطون کی تعلیم میں سقراط کی تعلیم کی جھلک باقی ہے کہ وہ حق، خیر اور جمال کو ایک سمجھتا ہے۔ اگر ہم افلاطون کی تعلیم میں یہ تلاش کریں کہ اس کے نزدیک وہ کون سے عناصر ہیں جو اشیائے جمیلہ میں مشترک طور پر پائے جاتے ہیں، تو منتشر طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تناسب، توازن، یا کسی چیز کے اجزا کا ایک وحدت کے ماتحت ہونا اس کو حسین بنا دیتا ہے۔ وحدتِ حسن کی سادہ ترین مثال اس کے ہاں کسی ایک رنگ کی پاکیزگی یا کسی ایک خط کی راستی ہے جس میں ابھی کثرتِ اجزا کی وحدت کا کوئی سوال نہیں ہے لیکن اس کے باوجود خوب صورت معلوم ہوتی ہے لیکن افلاطون اپنے عام میلان کے ماتحت فوراً جمالِ محسوس سے گزر کر اس کا اطلاق ماورائے ادراک پر کرنا چاہتا ہے۔ وہ حُسنِ نفس اور حسنِ اخلاق کو بھی اسی میں شامل کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ حسنِ تناسب کی بہترین مثال ایک خوب صورت جسم کا ایک خوب صورت نفس کے ساتھ اتحاد ہے۔ فقط استدلالی منطق کو کاشفِ حقیقت سمجھنے اور فقط ماورائے ادراک عالم کو حقیقی قرار دینے کی وجہ سے وہ فنونِ لطیفہ کو نظرِ تحقیر سے دیکھتا ہے کیونکہ فنونِ لطیفہ نفسِ انسانی کو نورِ عقل سے نکال کر محسوسات کے دھندلکے میں لے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے نصب العینی جمہوریہ میں وہ شاعروں پر بڑا شدید احتساب قائم کرتا ہے تاکہ جہاں تک ہو سکے فنِ لطیفہ کو سیاسی اور اخلاقی اغراض کا آلہ بنایا جائے۔

قدیم فلسفے کے تمام شعبوں کو انتشار سے پہلے پہل ارسطو نے نکالا۔ اگرچہ وہ بھی منطق یا اخلاقیات کی طرح جمالیات کو منظم و مرتب نہ کر سکا لیکن اس نے جمال اور فنونِ لطیفہ کے بعض عام اصول قائم کرنے کی کوشش کی۔ شاعری اور خطابت پر اس نے جو رسالے لکھے ان میں ان فنون کی نسبت بعض عام نظریات پیش کرنے کے علاوہ عام احساسِ جمال کی نسبت بھی بعض اصول قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مضمون کی نسبت بعض نہایت قیمتی افکار اس کی دیگر تصانیف میں بھی بکھرے

ہوتے ملتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ خیر اور جمال یا نیکی اور حُسن ایک چیز نہیں ہیں، نیکی عمل سے تعلق رکھتی ہے اور حسن ساکن اور بے عمل اشیا میں بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن یونانی ہونے کی حیثیت سے اس کے باوجود اس کا خیال ہے کہ بعض حالات میں خیر کو جمیل بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ جمیل اور "مفیدِ طلب" میں بھی امتیاز کرتا ہے اور حسن کو مفاد اور ضرورت سے بالاتر قرار دیتا ہے۔ ذوقِ جمال کی ایک امتیازی خصوصیت اس نے یہ بیان کی ہے کہ اس سے جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ جذبات و شہوات سے پاک ہوتی ہے۔ معروضی حیثیت سے ترتیب، جوانب، (SYMMETRY) اور تعین، جمال کے عام عناصر ہیں۔ ان کے علاوہ کتاب الشعر میں وہ کہتا ہے کہ جمال کے لیے ایک معین حجم کی بھی ضرورت ہے۔ ہر شے کا حسن ایک خاص حجم کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر حجم بہت زیادہ ہو جائے تو وہ دلکش معلوم نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر وہ معین حجم سے بہت چھوٹی ہو تو بھی اس کا حسن غائب ہو جائے گا۔ فنونِ لطیفہ کی نسبت بھی ارسطو کے خیالات افلاطون کے مقابلے میں بہت عمیق عالمانہ بصیرت کی شہادت دیتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مفاد سے قطع نظر کر کے فنون لطیفہ سے ایک بلاواسطہ لذت حاصل ہوتی ہے جو کسی خارجی غرض سے تعلق نہیں رکھتی۔ براہِ راست ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے والے صنائع کو وہ میکانکی صنائع کہتا ہے جیسے کہ معمار، بڑھئی یا لہار کا کام۔ کسی مادی ضرورت کو پورا کرنا فنونِ لطیفہ کا کام نہیں ہے۔ افلاطون نے مصوری اور شاعری کو فطرت کی ایک ناقص نقالی قرار دیا تھا لیکن ارسطو اس خیال کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ فنِ لطیف حقائقِ ازلیہ کو محسوس صورت میں ظاہر کرتا ہے اس لیے وہ انکشافِ حقیقت کا ایک نہایت عمدہ ذریعہ ہے۔ دیانتِ فکر کی اس سے بہتر اور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ ارسطو نے اگرچہ کبھی خود شعر نہیں کہا اور اس کی خاص حیثیت یہ ہے کہ وہ علما و فلاسفہ کا امام ہے، لیکن وہ حقیقی شاعری کو فلسفے سے بلند تر قرار دیتا ہے۔ مذکورہ صدر افکار کی صداقت اور اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ارسطو کے ہاں بھی خیالات کے یہ جواہر پارے منتشر رہے اور مستقل طور پر کسی علم میں منسلک نہ ہو سکے۔

یونانی فلاسفہ میں آخری مفکر جو اس بارے میں قابلِ ذکر ہے، فلاطینوس ہے، جو جدید فلاطونیت (NEO-PLATONISM) کا بانی ہے۔ جمالیات میں اس کے خیالات اصلاً افلاطون ہی سے ماخوذ ہیں وہ بھی افلاطون

کی طرح عقلِ کُل کو ایک مستقل وجود تصوّر کرتا ہے جو ذاتِ مطلق کا اولین مظہر ہے۔ زندگی میں تمام حیات و نظم کا مبدا عقلِ کُل ہے۔ بے جان مادّے پر جب یہ عقل عمل کرتی ہے تو اس میں زندگی اور حسن کا ظہور ہوتا ہے۔ جو شے جس قدر اس عقلِ عالم سے بہرہ اندوز اور اس سے متاثر ہے اسی قدر وہ جمیل ہے۔ کسی چیز کے بدصورت ہونے کے یہ معنی ہیں کہ عقل نے اس پر عمل نہیں کیا اس لیے وہ صورت پذیر نہیں ہوئی، خود عقلِ خلّاق ہی حسنِ مطلق ہے جو سب چیزوں سے زیادہ جمیل ہے۔ مظہرِ جمال کے تین مدارج ہیں۔ سب سے اعلیٰ جمال عقلِ انسانی میں پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد نفسِ انسانی کا مرتبہ ہے جس کا حسن جسم سے وابستہ ہو جانے کی وجہ سے مقابلتاً ناقص ہے۔ حسن کا ادنیٰ ترین ظہور اشیا میں پایا جاتا ہے۔ افلاطون کی طرح اس کا بھی یہ خیال ہے کہ ایک ایسی شے بھی خوب صورت ہو سکتی ہے جو اجزا میں منقسم نہیں ہے۔ خالص وحدت اور سادگی بھی حسن ہو سکتی ہے۔ وہ رنگوں کو خاص طور پر حسین سمجھتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے نزدیک نورِ عقل اور نورِ وجود کے مظاہر ہیں۔ فنونِ لطیفہ کے حُسن کی نسبت وہ کہتا ہے کہ اگر صاحبِ فن کسی تصورِ حقیقی کو محسوسات کا جامہ پہنانا چاہتا ہے اور اس میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کی تخلیق فطرت کی اشیا پر فوقیت رکھتی ہے۔ شاعر یا مصور ایسے خیال کو ادا کر سکتا ہے جو مادّی فطرت میں پوری طرح ظاہر نہ ہو سکا ہو۔ اس خیال میں فلاطینوس، افلاطون سے آگے نکل گیا ہے اور اس کی تعلیم جدید فنی تصوّریت سے بہت زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔

فلسفۂ قدیم میں جمالیات کا سرمایہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ صدیوں تک اس پر کچھ اضافہ نہ ہو سکا، یہاں تک کہ کانٹ نے دورِ جدید میں از سرِ نو اس پر فلسفیانہ نظر ڈالی اور مستقل طور پر اس کے مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی۔